عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ

از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

اگست ۱۹۵۵ء میں ہماری مرکزی حکومت نے سات افراد پر مشتمل ایک کمیشن بٹھایا تھا جس کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا تھا کہ وہ نکاح، طلاق اور کفالت وغیرہ سے متعلق موجودہ قوانین کا جائزہ لے کر بتائے کہ کیا عورت کو معاشرہ میں اس کی اصلی جگہ دلانے کے لیے ان میں کسی ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے، نیز وہ نکاح و طلاق کی رجسٹری، طلاق بذریعہ عدالت اور ازدواجی امور سے متعلق خاص عدالتوں کے قیام کے متعلق بھی اپنی رایوں کا اظہار کرے۔

اس کمیشن کے صدر خلیفہ شجاع الدین مرحوم بنائے گئے تھے اور ارکان میں مندرجہ ذیل حضرات تھے:

۱۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب،

۲۔ مولانا احتشام الحق صاحب،

۳۔ مسٹر عنایت الرحمٰن،

۴۔ بیگم شاہنواز،

۵۔ بیگم انور جی احمد،

۶۔ بیگم شمس النہار محمود

کمیشن کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد خلیفہ شجاع الدین صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس وجہ سے صدارت کے لیے ان کی جگہ پر میاں عبدالرشید صاحب سابق چیف جسٹس پاکستان کا انتخاب عمل میں آیا۔

اس کمیشن نے اپنی رپورٹ مرتب کر کے حکومت کے حوالہ کر دی ہے اور حکومت کی طرف سے یہ ۲۰ جون ۵۶ء کے سرکاری گزٹ میں شائع ہو گئی ہے۔ کمیشن کے ارکان میں سے مسٹر عنایت الرحمٰن صاحب نے

کمیشن کی کارروائیوں میں، اگرچہ عملاً کوئی حصہ نہیں لیا لیکن اس رپورٹ کو ان کی منظوری حاصل ہے۔ مولانا احتشام الحق صاحب نے اس پر کوئی اختلافی نوٹ لکھا ہے لیکن وہ اس رپورٹ کی اشاعت کے وقت تک موصول نہیں ہوا تھا اس وجہ سے وہ اس میں شامل نہیں ہے۔ اس کے متعلق وعدہ کیا گیا ہے کہ موصول ہوتے ہی ایک ضمیمہ کی حیثیت سے اس کو شائع کر دیا جائے گا۔ اس طرح یہ رپورٹ عملاً صاحب صدر کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب اور مذکورہ تینوں بیگمات کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

رپورٹ کی اہمیت یہ رپورٹ مختلف اعتبارات سے بڑی اہمیت رکھتی ہے: جن میں سے بعض کی طرف میں یہاں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس رپورٹ میں جو سفارشات پیش کی گئی ہیں وہ اگر منظور ہو جائیں تو ہماری معاشرتی زندگی کا موجودہ ڈھانچہ یک قلم تبدیل ہو جائے گا۔ وہ ساری اساسات بھی اس تبدیلی کے نتیجے میں ختم ہو جائیں گی جن پر اسلام نے ہمارے معاشرتی نظام کو قائم کیا ہے اور وہ ساری روایات بھی (عام اس سے کہ وہ غلط ہیں یا صحیح) ختم ہو جائیں گی جن کا عام طور پر احترام کیا جاتا رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس رپورٹ کی منظوری ہمارے معاشرہ کے کسی ایک ہی طبقہ کو متاثر نہیں کرے گی بلکہ اس کے تلخ و شیریں نتائج میں سے اس ملک کا ہر شہری حصہ پائے گا: عام اس سے کہ وہ امیر ہو یا غریب۔ شہری ہو یا دیہاتی، متمدن ہو یا وحشی، عورت ہو یا مرد، نیک ہو یا بد، بلکہ سچ پوچھیے تو اس کے دور رس نتائج کی زد سے وہ چھوٹے یا بڑے ادارے بھی نہ بچ سکیں گے جو آپ کے معاشرے کی مختلف ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ یہاں تک کہ آخری نتیجے کے طور پر اس سے ہماری ریاست بھی اس سے ایک بالکل ہی مختلف ہیولیٰ اختیار کرے گی جو ہمارے نئے دستور نے اس کا پیش کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس رپورٹ کے مرتبین نے ہمیں کچھ نئے نظریات اور نئے اصولِ اجتہاد دیئے ہیں جن سے ہم بالکل پہلی مرتبہ آشنا ہوئے ہیں۔ سابق ائمہ و مجتہدین سے ہمیں جو کچھ ورثہ میں ملا ہے اس کے پورے ذخیرہ میں ہمیں ان نظریات اور ان اصولوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ یہ اصول اگر تسلیم کر لیے جائیں (اور اس رپورٹ کے تسلیم کر لینے کے معنی یہی ہیں کہ ہم نے ان کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا) تو نہ صرف ہمارا وہ پورا

دینی ذخیرہ ایک دفتر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جو بارہ تیرہ سو سال میں مرتب ہوا ہے بلکہ سرے سے قرآن و حدیث بھی ایک لایعنی شے بن کے رہ جاتے ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ دستور کے نفاذ کے بعد یہ بالکل پہلی چیز ہمارے سامنے آئی ہے جس سے اس اسلامی زندگی کا کچھ آئیڈیا ہوتا ہے جو ہمارے ملکی اکابر اور ان کے ہم رنگ و ہم مشرب حضرات کے ذہنوں میں ہے۔ نیز دستور میں یہ جو ضمانت دی گئی ہے کہ اس ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہونگے، جو غیر اسلامی قوانین یہاں جاری ہیں وہ اسلامی قوانین سے بدلے جائیں گے، ایک کمیشن بیٹھے گا جو ان قوانین کو مرتب کریگا اور ان کے نفاذ و اجرا کے لیے اقدامات و مراحل تجویز کرے گا، یہ ساری چیزیں کس طرح واقع ہونگی اور یہ وعدے عملی جامہ کس طرح پہنیں گے؟ ان سوالوں کا جواب بڑی وضاحت سے یہ رپورٹ دیتی ہے۔

یہ سارے پہلو اس بات کے متقاضی ہیں کہ اس رپورٹ کو محض سرسری نظر سے دیکھکر اس کو آگے کے مراحل سے گزر جانے کے لیے چھوڑ نہ دیا جائے بلکہ اس کی ایک ایک چیز کو اچھی طرح تجزیہ کر کے سمجھا جائے اور اگر یہ فی الواقع انہی نتائج کی حامل ہے جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے تو اس فتنہ کے سدباب کی تدبیریں کی جائیں۔ آخر یہ نتائج ہمارے ہی سامنے آنے ہیں کسی اور کے سامنے نہیں آنے ہیں۔

ان گوناگوں اہمیتوں کے پیش نظر میں اس رپورٹ پر مفصل تبصرہ کرنا چاہتا ہوں یہ تبصرہ چار مختلف پہلوؤں سے ہوگا۔ پہلے میں پیش نظر مقصد کے لحاظ سے اس کمیشن کی تشکیل کی نوعیت پر کچھ روشنی ڈالوں گا۔ اس کے بعد یہ بتاؤنگا کہ ہمارے موجودہ دستور کی رو سے اس کمیشن کی حیثیت کیا ہے؟ پھر ان جدید نظریات اور اجتہاد کے ان نئے اصولوں پر تبصرہ کروں گا جو اس رپورٹ کے ذریعہ سے بالکل پہلی مرتبہ ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس کے بعد وضاحت کے ساتھ ان سفارشات کو زیر بحث لاؤنگا جو کمیشن نے پیش کی ہیں اور یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ سفارشات کتاب و سنت اور حالات و مصالح سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں اور اگر یہ منظور ہو جائیں تو ان سے کن نتائج کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

لیکن یہ بحث نامکمل رہے گی اگر اس تبصرے کو تبصرہ ہی کی حد تک محدود رکھا جائے۔ اس تبصرہ سے یہ تو ممکن ہے کہ رپورٹ کی خامیاں اور غلطیاں سامنے آجائیں لیکن صرف اتنے سے اصل مسئلہ حل نہیں

ہوتا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے موجودہ عائلی نظام میں بہت سی خرابیاں گھس آئی ہیں جو ان پاکیزہ اصولوں اور ان پاکیزہ تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں جن پر اسلام نے ہمارے عائلی نظام کو قائم کیا تھا۔ اس وجہ سے اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سفارشات اسلام کے خلاف ہیں تو ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم وہ صحیح تدابیر بھی بتائیں جن سے موجودہ خرابیوں کی اصلاح ہو سکے۔ چنانچہ میں آخر میں وہ تدابیر بھی بتاؤں گا جو موجودہ خرابیوں کو دور کر سکتی ہیں۔

پیش نظر مقصد اور کمیشن اس کمیشن کے قیام کا مقصد، جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے، ہمارے موجودہ عائلی قوانین کا جائزہ لے کر یہ بتانا تھا کہ عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے ان قوانین میں کسی ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے؟ اور اگر ضرورت ہے تو کس قسم کی اصلاح کی ضرورت ہے؟

ہر شخص جانتا ہے کہ یہ عائلی قوانین کم و بیش وہی ہیں جو انگریزوں نے محمڈن لا کے نام سے اپنے زمانۂ حکومت میں (غالباً ۱۷۷۲ء میں) جاری کیے تھے۔ اس ملک میں چونکہ حنفی المذہب مسلمانوں کی اکثریت تھی اس وجہ سے قدرتی طور پر یہ محمڈن لا فقہ حنفی پر مبنی ہوا اور اس کے لیے وہی کتابیں ماخذ بنیں جو حنفیوں کے نزدیک معتبر خیال کی جاتی تھیں۔ مثلاً ہدایہ، فتاویٰ عالمگیری اور سراجی وغیرہ؎۔ ان کتابوں کے خود انگریزوں ہی نے اپنے اہتمام میں ترجمے کرائے اور بحث و استدلال اور عدالتی فیصلوں میں یہی کتابیں حوالہ کی کتابوں کی حیثیت سے مستند و معتبر تسلیم کی گئیں۔

کمیشن کے فاضل ارکان کے نزدیک یہ انگریزوں کی ایک چال تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کو محمڈن لا کے ساتھ باندھ کر رکھ دیا جس کے سبب سے ان کی سوسائٹی بالکل جامد ہو کر رہ گئی اور بدلتے ہوئے حالات کے قدم بقدم اس کو تبدیل ہونے اور ترقی کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

> "رومیوں کی طرح انگریزوں نے بھی مختلف مذہبی گروہوں کے پرسنل لا میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت مسلمانوں میں ان قوانین کو جاری کیا گیا جو اینگلو محمڈن لا کے نام سے موسوم ہیں۔ اسلامی قانون جس کا اجرا اس شکل میں شروع ہوا وہ ترقی پذیر حالات اور زمانے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ دینے والا ذی روح وجود نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کے لیے پرسنل لا کے نام سے جو

؎ شیعوں کے لیے غالباً کتاب شرائع الاسلام۔

> چیز اختیار کی گئی تھی وہ بالکل دقیانوسی، جامد اور مختلف اعتبارات سے غیر واضح تھی لیکن سیاسی غلامی کے سبب سے اس کی اصلاح یا تجدید ناممکن تھی۔" (گزٹ آف پاکستان ص ۱۲۰۳)

میں یہ بات سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ کمیشن کے فاضل ارکان کو انگریزوں پر کس بات کا غصہ ہے؟ کیا اس بات کا کہ جب انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے ترقی پسندانہ قوانین کے تحت کر دیا تھا تو یہ ذرا سا تسمہ پرسنل لا کا کیوں لگا چھوڑ دیا، اس کی جگہ پر بھی اپنے ہی ترقی پسندانہ قوانین کیوں جاری کر دیتے کہ اس دقیانوسی اور جامد قانون کا ہمیشہ کے لیے قصہ ہی پاک ہو جاتا؟ یا اس بات کا کہ انھوں نے ہدایہ اور عالمگیری اور سراجی جیسی دقیانوسی کتابیں کیوں عدالتوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیں، کیوں چند ترقی پسند بیگمات اور کسی خلیفہ عبدالحکیم پر مشتمل ایک کمیشن بٹھا کر ان کتابوں میں اصلاحات اور ترمیمات کرائیں؟ یا اس بات پر ان فاضل ارکان کو غصہ ہے کہ انگریزوں نے رومیوں کی اندھی تقلید میں مختلف مذہبی گروہوں کے پرسنل لا کی حفاظت کی دقیانوسی پالیسی پر کیوں عمل کیا، کیوں نہ اس فرسودہ پالیسی ہی کا خاتمہ کر دیا کہ سب کے سب ایک ہی ساتھ ڈوبتے اور ایک ہی ساتھ ترتے؟

میرے نزدیک ارکان کمیشن کا یہ غصہ جس سبب سے بھی ہو، بالکل بیجا ہے۔ انگریزوں سے زیادہ اس بات کا کوئی شائق نہیں تھا کہ وہ ہماری زندگی کے ہر گوشے اور ہر شعبے کو بالکل مغربی رنگ میں رنگ دیں (اور اگر وہ رنگ دیتے تو اس میں تو شبہ نہیں کہ آج ہمارے اس کمیشن کا کام بڑا آسان ہو جاتا بلکہ شاید اس طرح کے کسی مقصد کے لیے کسی کمیشن کے بٹھانے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی، جس منزل پر پہنچنے کے آج ہم ارمان رکھتے ہیں اس پر آج سے بہت پہلے ہم پہنچ چکے ہوتے)، لیکن انگریز اس ملک پر حکومت کرنا چاہتے تھے اس وجہ سے وہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ وہ پرسنل لا کی نزاکتوں کو سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم نے جن لوگوں کا ملک چھینا ہے وہ اس صدمہ کو تو شاید کچھ عرصے کے بعد بھول جائیں لیکن اگر ہم نے ان کے پرسنل لا کو بھی قانون کے زور سے بدلنا چاہا تو پھر یہ ہم کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔

پرسنل لا کسی قوم کی آخری متاع ہوتی ہے جس کے لٹ جانے کے بعد وہ قوم بالکل ہی بے مایہ

ہو جاتی ہے۔ سب کچھ کھو دینے کے بعد بھی اگر کسی قوم کا پرسنل لا باقی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا تشخص ابھی باقی ہے اور جب تک تشخص باقی ہے تو گویا اس کی ہستی بھی قائم ہے۔ لیکن اگر یہ بھی باقی نہ رہا تو گویا اس کی ہستی ہی سرے سے ختم ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنے پرسنل لا کی حفاظت کے لیے اپنا آخری زور لگا دیتی ہے اور بسا اوقات اس کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر مغرور سے مغرور فاتحوں اور مستبد سے مستبد حکمرانوں نے بھی اپنی رعایا کے پرسنل لا کا احترام کیا۔ رومیوں نے اگر احترام کیا تو اس کی وجہ، جیسا کہ کمیشن کے فاضل ارکان نے سمجھی ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے محکوموں کے معاشرہ کو جامد دیکھنا پسند کرتے تھے اور اگر انگریزوں نے ہمارے پرسنل لا کا احترام کیا تو اس کی وجہ بھی یہ نہیں تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم ہدایہ اور عالمگیری ہی کے چکر میں رہیں، ان سے باہر نہ نکل سکیں، بلکہ اس کی وجہ وہی ہے جو عرض کی گئی۔ وہ اس رمز سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ اپنے پرسنل لا کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی مذہبی اور جذباتی ہے۔ وہ اس کو چھیڑ کر کوئی فائدہ تو اٹھا نہ سکیں گے البتہ اپنے اقتدار کے لیے جس کی جڑیں ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھیں، ایک بہت بڑا خطرہ مول لے لیں گے۔ بھارت میں جہاں مسلمانوں کو جان و مال کا تحفظ بھی حاصل نہیں ہے، دستور کی حد تک ہی سہی، ان کا پرسنل لا محفوظ ہے۔ خود ہم نے اپنے دستور میں پاکستان کے اندر بسنے والی اقلیتوں کے پرسنل لا کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ کیا یہ ضمانت ہم نے اس خیال سے دی ہے کہ ان کا معاشرہ جامد رہے اور وہ تجدد کی منزلیں طے نہ کر سکیں یا اس لیے دی ہے کہ آج ہر نظام میں خواہ دینی ہو یا لادینی اس کے احترام کو اس وجہ سے ضروری قرار دے دیا گیا ہے کہ لوگوں کے احساسات اس بارے میں نہایت نازک ہوتے ہیں اور اس میں کسی مداخلت کو لوگ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتے۔

ارکانِ کمیشن کا یہ خیال بھی بالکل غلط ہے کہ انگریزوں نے پرسنل لا کے نام سے جو چیز اختیار کی وہ دقیانوسی، فرسودہ اور جامد تھی۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ محمڈن لا کی بنیاد ہدایہ، عالمگیری اور معاملاتِ میراث میں سراجی پر ہے۔ یہ اسلامی قانون کی وہ کتابیں ہیں جو اس حکومت میں قضا اور فتوے کی بنیاد رہ چکی تھیں جس کی جگہ انگریزوں نے لی تھی اس وجہ سے قدرتی طور پر جب انگریزوں نے پرسنل لا کی حد تک

اسلامی قوانین کو باقی رکھنا چاہا تو وہ انہی کتابوں پر اعتماد کرنے پر مجبور ہوئے جن پر مسلمانوں کو پہلے سے اعتماد تھا۔

ان کتابوں کو آج آپ جو چاہیں گالیاں دے لیں، آپ کو کوئی روک نہیں سکتا لیکن جس زمانہ میں انگریزوں نے ان کتابوں کو محمڈن لا کی اساس کی حیثیت سے اختیار کیا تھا اس زمانے میں کوئی شخص ان کی نسبت وہ الفاظ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا جو آج کہے جا رہے ہیں۔ ہدایہ آج بھی فقہ حنفی کی امہات میں شمار ہوتی ہے اور اسلامی قانون کا کوئی طالب علم اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ کمیشن کے ارکان کی نسبت تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس سے واقف ہیں یا نہیں لیکن کمیشن کے فاضل صدر کی نسبت میں یہ گمان رکھتا ہوں کہ وہ کم از کم ہملٹن کے ترجمہ کے واسطہ سے اس سے واقف ہوں گے اور اس کے بارے میں ہملٹن کی رائے سے بھی بے خبر نہیں ہوں گے۔ ہماری قوم میں جسٹس محمود جس پایہ کے قانون دان گذرے ہیں اس پایہ کا کوئی دوسرا قانون دان نہ گزرا اور نہ آج بد قسمتی سے کوئی موجود ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی نسبت جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ بھی پاکستان کے سابق چیف جسٹس سے مخفی نہیں ہو سکتے۔ فتاوائے عالمگیری کا حال یہ ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی تصنیف نہیں ہے بلکہ گیارھویں صدی ہجری میں اس کو مرتب کرنے کے لیے سلطان محمد اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے پورے ملک کے مشہور و مستند علماء کا ایک بورڈ قائم کیا تھا اور اس بورڈ نے یہ مقصد پیش نظر رکھ کر اس کو مرتب کیا تھا کہ یہ مغلیہ سلطنت کی عدالتوں کے لیے ایک مدوّن ضابطہ کی حیثیت سے کام دے۔ اگرچہ پیش نظر مقصد کے لحاظ سے یہ کتاب نئے اسلوب پر تو مدون نہ ہو سکی تاہم یہ برابر فقہ حنفی کے ایک معتبر ترین مجموعے کی حیثیت سے حکام اور مفتیوں دونوں کا مرجع رہی ہے۔ یہی حال سراجی کا ہے۔ کم از کم میراث کے مسائل میں اس سے زیادہ مرتب، مختصر اور مستند کتاب آج بھی کوئی موجود نہیں ہے۔ بہر حال انگریزوں نے جو محمڈن لا جاری کیا اس کی بنیاد انہی کتابوں پر تھی اور یہ کتابیں فقہ حنفی کی آج بھی معتبر و مستند کتابیں ہیں۔

مجھے اس امر سے انکار نہیں ہے کہ انگریزوں نے جو محمڈن لا جاری کیا وہ بعض اعتبارات سے ناقص تھا اور جن کتابوں سے اخذ کردہ مواد پر یہ مبنی تھا وہ کتابیں بھی جانچنے پرکھنے کی محتاج تھیں۔ بہت اچھا ہوتا اگر پہلے ہی کتاب و سنت کی کسوٹی پر اس کو پرکھنے اور اس کے صحیح و سقیم میں امتیاز کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی اور

اگر پہلے یہ کوشش نہیں کی گئی تو اب تو نہایت ضروری ہے کہ اس سارے محمڈن لا کو از سر نو جانچ کر اس کو براہِ راست کتاب و سنت کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس میں تغیر اور اصلاح کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ اعتراض اگر ہے تو اس بات پر ہے کہ اس کام کے لیے جو کمیشن بٹھایا گیا وہ اس اہم اور نازک کام کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں تھا۔ یہاں پیشِ نظر کام یہ نہیں تھا کہ انگریزوں نے محمڈن لا کے نام سے ہمارے عائلی نظام کے لیے کچھ ضابطے جاری کر رکھے تھے جو فرسودہ اور کہنہ ہو چکے تھے، جن سے ہماری سوسائٹی کی ترقی رکی ہوئی تھی، ان کو موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ قوانین سے بدلنا ہے۔ اگر پیشِ نظر مقصد یہ ہوتا تو اس کے لیے یہ کمیشن بُرا نہیں تھا، ہم اس کی تشکیل پر کوئی اعتراض نہ کرتے۔ لیکن یہاں تو جیسا کہ عرض کیا گیا، درحقیقت فقہ حنفی پر نقد و نظر اور اس میں اصلاحات تجویز کرنے کا کام کمیشن کے سپرد کیا گیا تھا۔ ہدایہ، عالم گیری اور سراجی کی غلطیوں کی اس کو اصلاح کرنی تھی۔ بلکہ صحیح معنوں میں پوری فقہ اسلامی کے بہت سے مسلمات اصلاح و ترمیم کے لیے اس کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ یہ کام، ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ ہر کس و ناکس کے کرنے کا نہیں ہے۔ اس کو اگر کر سکتے ہیں تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کتاب و سنت سے براہِ راست گہری واقفیت رکھتے ہوں، جو احکام اسلامی کی حکمتوں اور مصلحتوں سے باخبر ہوں، جو اجتہاد اور قیاس کے اصولوں کا علم رکھتے اور ان کا استعمال جانتے ہوں، جو فہم شریعت میں اتنا درک رکھتے ہوں کہ کسی اجتہاد یا قیاس کو، بالخصوص جبکہ وہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر ائمہ کا ہو، براہِ راست کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کا سقم واضح کر سکتے ہوں اور ساتھ ہی اپنے اجتہاد کے وزن کو دلائل سے واضح کر سکتے ہوں۔ کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پورے کمیشن میں ایک شخص بھی ایسا ہے جو ان کاموں کا اہل ہے؟ ان کاموں کا اہل ہونا تو دور کی بات ہے، کیا ان میں سے کسی صاحب نے ہدایہ، عالمگیری اور سراجی کا براہِ راست مطالعہ نہ سہی، ان کتابوں کے وہ انگریزی ترجمے ہی پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے جو ہملٹن، سر ولیم جونز اور بایلی نے کیے ہیں؟ کیا ان میں سے کسی صاحب یا صاحبہ نے قرآن پر، حدیث پر، فقہ اسلامی پر کوئی چھوٹا یا بڑا کام کیا ہے؟ کوئی ریسرچ کی ہے؟ کوئی تصنیف فرمائی ہے؟ کوئی قابلِ ذکر مقالہ لکھا ہے؟ اور کچھ نہیں تو کبھی قرآن ہی کے تیسوں پاروں کی تلاوت

ہے، یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ اگر ان میں سے ہر سوال کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً جواب ان کا نفی ہی میں ہو سکتا ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ آج اسلامی شریعت اور اسلامی فقہ سے بھی زیادہ دنیا میں کوئی سائنس مظلوم ہو سکتی ہے جس میں اصلاح و ترمیم کے لیے وہ حضرات قلم اٹھاتے ہیں جو اس کی ابجد تک سے ناآشنا ہیں؟

کمیشن کی حیثیت دستور کی روشنی میں

اب اس کمیشن کی حیثیت پر اپنے موجودہ دستور کی روشنی میں غور کیجیے:-

یہ کمیشن حکومت پاکستان کے ایک اعلان مجریہ ۴ اگست ۵۵ء کی رو سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمارے ملک میں بہت اہم تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ ۲۳ مارچ ۵۶ء سے ہمارا نیا دستور نافذ العمل ہے۔ اس دستور کے نفاذ کے بعد وہ ساری چیزیں آپ سے آپ کالعدم ہو گئیں جو اس دستور کے منافی ہیں۔ دستور کے مطالعہ کے بعد میرا قطعی نظریہ ہے کہ ۲۳ مارچ ۵۶ء کے بعد سے اس کمیشن کی کوئی قانونی اور آئینی حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دستور کی دفعہ ۱۹۸ میں جو ضمانت دی گئی ہے کہ کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا اور یہ کہ موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق کیا جائے گا، اس کے متعلق ایک خاص شکل بھی متعین کر دی گئی ہے کہ اس دفعہ کے مقصد کو عملی جامہ صرف اس طریقے سے پہنایا جائے گا جو دفعہ مذکور کی ذیلی دفعہ ۳ میں تجویز کیا گیا ہے۔ یہ ذیلی دفعہ ۳ یہ ہے۔

"یوم دستور سے ایک سال کے اندر اندر صدر ریاست ایک کمیشن مقرر کرے گا:

(الف) جو سفارشات پیش کرے گا کہ

(۱) موجودہ قوانین کو اسلام کے احکام کے مطابق بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں، اور

(۲) ان اقدامات کو عملی شکل دینے کے لیے کیا مدارج ہوں، اور

(ب) ان احکام اسلام کو جن کو قانونی شکل دی جا سکتی ہے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی رہنمائی کے لیے موزوں شکل میں مرتب کرے گا۔

کمیشن اپنی آخری رپورٹ اپنے تقرر سے پانچ سال کے اندر اندر پیش کر دے گا۔ کوئی عارضی رپورٹ وہ اس سے پہلے بھی پیش کر سکتا ہے۔ یہ رپورٹ، خواہ عارضی ہو یا آخری، وصولی سے چھ ماہ کے اندر اندر نیشنل اسمبلی کے سامنے پیش کر دی جائیگی اور نیشنل اسمبلی اس پر غور کرنے کے بعد قوانین بنائے گی۔"

اس دفعہ کے آخر میں تشریح کے طور پر یہ بات بھی شامل کر دی گئی ہے کہ کسی مسلم فرقہ کے پرسنل لا پر اس دفعہ کو منطبق کرتے وقت کتاب و سنت کے الفاظ سے ان کی وہی تعبیریں مراد ہونگی جو متعلقہ فرقے کے لوگ پیش کرتے ہوں۔

اب اس دفعہ کے تمام تضمنات سامنے لائیے تو چند باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

(۱) یہ کہ اسلامی احکام کو قانون کی شکل دینے اور موجودہ قوانین کو احکام اسلام کے مطابق کرنے کی اس دستور کے نفاذ کے بعد صرف ایک ہی شکل ہے جو اختیار کی جا سکتی ہے اور وہ وہی ہے جو دفعہ ۱۹۸ کی ذیلی دفعہ ۳ میں بیان کی گئی ہے۔ دستور کے الفاظ (ONLY IN THE MANNER PROVIDED IN CLAUSE 3) اس معاملہ میں نہایت واضح طور پر حصر کرنے والے ہیں۔

(۲) صدر ریاست کے مقرر کیے ہوئے کمیشن کے سوا کوئی دوسرا کمیشن مذکورہ کام کے لیے بالکل آئین کے خلاف ہے۔

(۳) صدر ریاست کے مقرر کیے ہوئے کمیشن کا کام موجودہ قوانین کو احکام اسلام کے مطابق کرنے کے سلسلہ میں تدابیر بتانا، مدارج تجویز کرنا اور مجالس قانون ساز کی رہنمائی کے لیے قانون سازی کے لائق احکام کو موزون شکل میں ترتیب دے دینا ہے۔

(۴) پرسنل لا کے حد تک ہر مسلم فرقہ سے متعلق کتاب و سنت کی وہی تعبیریں معتبر ہونگی جو اس فرقہ کے لوگ پیش کرتے ہوں، کوئی دوسری تعبیر ان کے سر نہیں منڈھی جائے گی۔

اب اس عائلی کمیشن کی حیثیت پر غور فرمائیے۔

(۱) یہ کمیشن دستور کی دفعہ ۱۹۸ کی ذیلی دفعہ ۳ کے تحت صدر ریاست کا مقرر کردہ نہیں ہے۔ یہ کمیشن دستور کے نفاذ سے پہلے حکومت پاکستان نے مقرر کیا تھا۔

(۲) اِس کمیشن کے حدودِ کار (TERMS OF REFERENCE) اُس کمیشن کے حدودِ کار (TERMS OF REFERENCE) سے مختلف ہیں جو صدرِ ریاست کے مقرر کیے ہوئے کمیشن کے بتائے گئے ہیں

(۳) اس کمیشن نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے پرسنل لا پر پوری بیدردی سے ہاتھ صاف کیا ہے درآنحالیکہ دستور نے نہایت واضح الفاظ میں اس بات کی ضمانت دی ہے کہ ان معاملات میں کتاب و سنت کی وہی تعبیریں معتبر ہونگی جو اس فرقہ کے لوگ پیش کریں گے۔

اس تفصیل سے یہ بات بالکل صاف واضح ہے کہ ہمارے نئے دستور کے بعد اس کمیشن کی کوئی قانونی حیثیت باقی نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ حکومت نے ایک خلافِ آئین کمیشن پر قومی فنڈ کا روپیہ کیوں خرچ کیا؟ اور اگر حکومت اپنی اس غلطی پر متنبہ نہ ہو سکی تھی تو ارکانِ کمیشن نے آخر ایک بالکل غلط کام پر قوم کا روپیہ کیوں ضائع کرایا؟ کیا کمیشن کے فاضل ارکان اپنے دستور سے بھی اتنی ہی واقفیت رکھتے ہیں جتنی واقفیت قرآن و حدیث سے رکھتے ہیں یا اسلام میں ترمیمات پیش کرنے کا ان حضرات پر اتنا شوق غالب تھا کہ اس واضح حقیقت کی طرف توجہ دینے کی انہوں نے ضرورت ہی نہیں محسوس کی؟

ارکانِ کمیشن کے چند نظریات

اس رپورٹ کے شروع میں ایک تمہید اور اس کے آخر میں ایک خاتمہ ہے جن میں ارکانِ کمیشن نے اپنے کچھ نظریات اور چند اصولِ اجتہاد بیان کیے ہیں۔ یہ نظریات اور یہ اصولِ اجتہاد مختلف اعتبارات سے ہمارے نزدیک بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

اوّل تو کمیشن نے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ تمام تر انہی نظریات اور اجتہاد کے انہی اصولوں پر مبنی ہیں اس وجہ سے سفارشات پر غور کرنے سے پہلے ان کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ ثانیاً انہی سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ مذہب پر غور کرنے کے معاملے میں قدیم اور جدید نقطہائے نظر میں کیا فرق ہے؛ ثالثاً انہی سے یہ پتہ چلے گا کہ دراصل معاملہ صرف نکاح و طلاق کے قوانین ہی کی اصلاح کا نہیں ہے بلکہ پورے دین کی اصلاح کا ہے اور یہ صرف اس راہ میں پہلا قدم ہے۔

ان وجوہ سے میں چاہتا ہوں کہ کمیشن کے ان نظریات اور ان اجتہادی اصولوں کا بھی جائزہ لیا جائے۔ میں پہلے چند نظریات کا جائزہ لوں گا

اصل بحث سے پہلے میں اس رپورٹ کی ایک خاص خصوصیت ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ اس میں ارکانِ کمیشن نے اپنے اصلی نظریات صاف صاف الفاظ میں پیش کرنے کے بجائے ان کو اسلام اور قرآن کی تعریف و توصیف کے پردوں میں لپیٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے اسلام کی ابدیت و ازلیت پر، اس کے مطابقِ عقل و فطرت ہونے پر، اس کی سادگی و بے ساختگی پر، اس کے قیود و شرائط اور تمام پابندیوں اور تنگیوں سے پاک ہونے پر، اس کے لچکدار اور ہر ماحول کے ساتھ سازگار ہونے پر ایک شاندار تمہید ہوتی ہے اس کے بعد وہ نظریہ یا اصولِ اجتہاد بیان ہوتا ہے جو ارکانِ کمیشن پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ طریقہ انہوں نے محض پردہ داری کے لیے اختیار کیا ہے تاکہ لوگ پہلے ہی وہلہ میں بھڑک نہ جائیں یا یہ حضرات ذہنی الجھن کے مریض ہیں کہ بیک وقت متضاد قسم کی باتیں کرتے ہیں اور اس تضاد کو محسوس نہیں کرتے۔

مذہب کے متعلق کمیشن کا نظریہ مذہب ان حضرات کے نزدیک بس چند بنیادی حقائق اور اصولوں پر ایمان رکھنے کا نام ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتے، جو امٹ ہیں، جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں، جو لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں، جو محکمات ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

> "مذہب، قرآن کی تعریف کی رُو سے، نام ہے فطرت کے ان ناقابلِ تغیر قوانین اور زندگی کے ان بنیادی اصولوں پر ایمان رکھنے کا جو تبدیل نہیں ہوتے۔ ریاست اور معاشرہ جب تبدیل ہوتے ہیں یا کسی اہم تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو وہ صرف اپنے بالائی ڈھانچے ہی میں تبدیلی کرتے ہیں۔ ان ابدی اور مستحکم اصولوں میں کوئی تصرف نہیں کرتے جو قرآن کے ارشاد کے مطابق تمام مذہب کی اساس ہیں۔ اسلام کا مطالبہ بنی نوع انسان سے ان چند بنیادی اصولوں کو تھامے رکھنے کے لیے ہے جن کو قرآن کی پُرکنایہ زبان میں یوں تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ اس لوحِ محفوظ میں امٹ طور پر ثبت ہیں جو ام الکتاب یا تمام زندگی اور موجودات کا سرچشمہ ہے۔ ان بنیادوں

> کو نہ کسی کو تبدیل کرنے کا حق ہے نہ اختیار۔ یہ محکمات ہیں۔ (اس کے بعد ایک حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اظلم الناس قرار دیا ہے جو ایسے امور سے متعلق سوالات کرے جن میں لوگوں کو رائے اور عمل کی آزادی بخشی گئی ہے اور اس کے سوال کے سبب سے لوگوں پر کوئی پابندی عائد ہو جائے، پھر ارشاد ہوتا ہے) وسیع دائرہ میں قانون کی آزادی سے متعلق پیغمبر صلعم کا یہ طرزِ عمل اسلامی اصولِ فقہ کے اس مسلمہ اصول کی بنیاد ہے کہ جو چیز حتمی طور پر ممنوع نہیں ہے وہ اجتماعی اور شخصی فلاح و بہبود کے لیے اختیار کی جائے تو جائز ہے۔ اور ان معاملات میں قانون سازی کی آزادی کا ایک چارٹر ہے جن کے بارے میں کوئی قطعی حکم موجود نہیں ہے"
>
> (گزٹ آف پاکستان ص ۱۲۰۵)

مذہب کا یہ تصور بظاہر بہت معصومانہ نظر آتا ہے لیکن اس کی تہ میں اتریے تو اندازہ ہوگا کہ یہ تصور قرآن کا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ باطنیہ کا دیا ہوا ہے۔ جس طرح انہوں نے چند غیر معلوم اور عنقا صفت "حقائق"، کو مذہب کی اساس بنا کر ساری زندگی کو شریعت اور قانون کی پابندیوں سے آزاد کر دیا اسی طرح یہ حضرات بھی چند لامعلوم الاسم "ازلی" اور "ابدی" اصولوں کو، جو لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں اب تسلیم مان کر بقیہ ساری زندگی سے مذہب کو خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ کوئی ان حضرات سے پوچھے کہ قرآن نے مذہب کی یہ تعریف اپنے کس پارے اور کس سورہ میں کی ہے؟ فطرت کے وہ "ناقابلِ تغیر" اور زندگی کے وہ "بنیادی اصول" کیا ہیں جن کو مان لینے کا نام مذہب ہے؟ ان کا کوئی نام اور خارج میں ان کا کوئی وجود بھی ہے یا محض کمیشن کے ارکان کے ذہنوں ہی میں ان کا وجود ہے؟ میں نے اس پوری رپورٹ کی سطر سطر پڑھی ہے لیکن مجھے اس میں ان ناقابلِ تغیر اور امٹ اصولوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس رپورٹ میں تو خود قرآن کو بھی، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، زمانہ کے ساتھ ساتھ بدل جانے والا اور مٹ جانے والا قرار دیا گیا ہے پھر آخر وہ ابدی اصول کہاں ہیں؟ اگر یہ ازلی اور ابدی اصول صرف لوحِ محفوظ ہی میں ثبت ہیں تو یہ واضح ہونا چاہیے کہ ہماری زندگی کے ساتھ ان اصولوں کا ربط کس چیز کے واسطہ سے قائم ہوتا ہے؟ کیونکہ ہمارے سامنے تو صرف قرآن اور سنت ہی ہیں، لوحِ محفوظ تک رسائی تو صرف ارکان

کمیشن ہی کی ہو گی، ہم ہیچ میرزوں کی رسائی تو وہاں تک نہیں ہے۔

یہ حضرات مذہب کا ایک گول مول اور ننھا منا سا تصور دے کر یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ مذہب کو مولویوں نے خواہ مخواہ کو ایک ہوّا بنا رکھا ہے، وہ تو ایک نہایت مختصر اور سادہ سی چیز ہے۔ بس لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے چند ازلی اور ابدی حقائق ہیں ان کو مان لیجیے اللہ اللہ خیر سلّا، بقیہ ہماری ساری زندگی تو خود ہمارے حوالہ کی گئی ہے کہ ہم اس کو جس طرح چاہیں گذاریں اور اس کے لیے جو چاہیں قوانین و احکام ایجاد کریں، مذہب کو اس سے کیا سروکار؟ پیغمبرؐ نے تو ان لوگوں کو سختی سے ڈانٹا تھا جو ان ازلی اور ابدی حقائق کے بتا دینے کے بعد بھی سوالات پوچھ پوچھ کر پابندیوں میں اضافے کرانا چاہتے تھے، پیغمبر تو ہمیں ساری زندگی سے متعلق قانون سازی کا اختیارِ مطلق سونپ گئے ہیں، لوگ خواہ مخواہ کو بات بات پر مذہب کو بیچ میں لاتے ہیں۔

مذہب بالخصوص اسلام کے متعلق یہ تصور میرے نزدیک کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔ یہ تصور، جیسا کہ مَیں نے عرض کیا، یا تو باطنیہ کا ہے یا اباحیت پسندوں کا جو مذہب کا نام لیتے ہوئے اپنی خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنا چاہتے ہیں۔ مذہب صرف چند بنیادی اصولوں کے مان لینے ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک پورے نظامِ زندگی کا نام ہے جتنی وسعت زندگی کے اندر ہے اتنی ہی وسعت مذہب کے اندر ہے۔ جتنے پہلو زندگی رکھتی ہے اتنے ہی پہلو مذہب رکھتا ہے۔ زندگی فکر و نظر اور ادراک و تعقل کی نعمت سے بہرہ ور کی گئی ہے اس وجہ سے مذہب عقل کی رہنمائی کے لیے رہنما اصول دیتا ہے، زندگی چونکہ عمل کے لیے بنی ہے اس وجہ سے وہ اعمال کو ٹھیک کرنے کے لیے بھی ایک جامع پروگرام دیتا ہے۔ زندگی کو چونکہ خاندان، سوسائٹی، معاشرہ، سیاست اور حکومت سب سے سابقہ پیش آتا ہے اس وجہ سے وہ ان سارے شعبوں میں بھی وہ چاروں گوشے (FOUR CORNERS) متعین کرتا ہے جن کے اندر رہ کر انسان فلاح حاصل کر سکے۔ پھر زندگی کو چونکہ مرنے کے بعد بھی باقی رہنا ہے اس وجہ سے مذہب آخرت کی کامیابی کے اصول بھی بتاتا ہے۔ الغرض مذہب نے ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا ہے جس کی حد بندی نہ کر دی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان چاروں گوشوں کے اندر ہمیں اس نے قانون بنانے کی آزادی

بھی بخشی ہے لیکن یہ آزادی شترِ بے مہار قسم کی آزادی نہیں ہے کہ ہم چاروں حدیں توڑ کر جدھر چاہیں نکل جائیں۔ بلکہ اس نے یہ ہدایت کی ہے کہ جو معاملات ہمارے سامنے ایسے آئیں جن میں خدا اور رسول کی طرف سے کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو تو وہاں ہمیں خدا اور رسول کے معلوم احکام کے اشارات، ان کے مقتضی اور ان کی روح کو سامنے رکھ کر کوئی ایسی بات متعین کرنی چاہیے جو ہمارے علم و فہم کے حدتک ان معلوم احکام سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتی ہو۔ اسی چیز کو اسلام کی اصطلاح میں اجتہاد سے تعبیر کیا گیا ہے جس پر ہم آگے چل کر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

یہاں زندگی کے ہر شعبے اور گوشے سے متعلق اسلام کے احکام کا حوالہ دینا تو ممکن نہیں ہے لیکن ہم بطورِ مثال ازدواجی زندگی سے متعلق، جو اس کمیشن کے زیرِ بحث ہے، اسلام کے ان چند احکام کا حوالہ دیتے ہیں جو ہماری زندگی کے اس حصہ کی حد بندی کرتے ہیں۔ وہ احکام یہ ہیں:۔

عورت اور مرد کے درمیان جائز رشتہ صرف نکاح کا رشتہ ہے جو مہر اور احصان کے شرائط کے ساتھ مشروط ہے[1]۔ محرمات سے نکاح ناجائز ہے۔ میاں اور بیوی دونوں پر یکساں حقوق اور یکساں ذمہ داریاں ہیں لیکن خاندان کی شیرازہ بندی کے لیے مرد کو عورت پر قوامیت حاصل ہے۔ نان نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ نکاح کی گرہ کو کھولنا اور باندھنا صرف مرد کے اختیار میں ہے۔ عورت کسی ناانصافی کی صورت میں خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ مرد نشوز کی صورت میں عورت کو مناسب تادیب کر سکتا ہے۔ مرد کسی اجتماعی یا خاندانی یا شخصی مصلحت کے تحت عدل کی شرط کے ساتھ ایک سے لے کر بیک وقت چار تک نکاح کر سکتا ہے لیکن عورت بیک وقت ایک ہی مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے۔

یہ اور اسی طرح کے چند اصولی احکام خود قرآن نے دیئے ہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احکام کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔ ان سب کو ملا دینے سے اس خاندانی نظام کا پورا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے جو اسلام میں مطلوب ہے۔ میں ارکانِ کمیشن سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ازدواجی زندگی سے متعلق یہ اصول ان بنیادی اصولوں میں شامل ہیں یا نہیں جو ارکانِ کمیشن کی لوحِ محفوظ

---

[1] ملک یمین کا ذکر ہم نے اس لیے نہیں کیا کہ اب یہ چیز خارج از بحث ہے۔

میں ثبت ہیں، جو امسٹ ہیں اور جن کو ماننا ضروری ہے ؟

ارکان کمیشن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے معاملات میں سوالات کرنے سے روکا ہے۔ آپ نے لوگوں کے ہزاروں سوالات کے نہ صرف جوابات نہایت خندہ پیشانی سے دیئے ہیں بلکہ سوال کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی ہے۔ انہی سوالات کے ذریعہ سے قرآن کے بہت سے اجمالات کی وضاحت ہوئی ہے اور بہت سی نئی صورتوں کے لیے شریعت کا حکم معلوم ہوا ہے۔ جن لوگوں نے یہ سوالات کیے انہوں نے پابندیوں میں نہیں اضافہ کیا ہے بلکہ امت کے لیے برکتوں اور رحمتوں کے اضافہ کے موجب ہوئے ہیں۔ آپ نے اگر سوالات سے روکا ہے تو اس طرح کے سوالات سے روکا ہے جس طرح کے سوالات بنی اسرائیل کیا کرتے تھے۔ مثلاً ان کو گائے کی قربانی کا حکم دیا گیا تو انہوں نے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ اس کے سینگ اور اس کی دم کیسی ہو؟ اس کی عمر کتنی ہو؟ اس طرح کے بے فائدہ اور غیر ضروری سوالات کو حضور نے ناپسند فرمایا ہے۔

بہرحال ارکان کمیشن نے دین کا یہ جو تصور پیش کیا ہے کہ وہ صرف چند اصولوں کے مان لینے کا نام ہے وہ اس دین کا تو ہو سکتا ہے جو ان کے اپنے ذہنوں میں ہے لیکن یہ اسلام کا تصور نہیں ہے اسلام تو جیسا کہ عرض کیا گیا ایک پورا نظام زندگی ہے اور اس پورے کو بلا کسی تقسیم و تفریق کے ماننے کا مطالبہ ہے اس کے کسی ایک جزو کا انکار سب کا انکار ہے۔

قرآن حکیم کے متعلق ارکان کمیشن کا تصور اسی طرح اسلام کی ازلیت و ابدیت پر ایک شاندار خطبہ دینے کے بعد قرآن حکیم کے متعلق یہ ارشاد ہوتا ہے :۔

> "اسلام دوسرا نام ہے زندگی کے ان اصولوں کا جو زمانے کے اس مد و جزر سے متاثر نہیں ہوتے جس سے دنیا کی ساری دوسری قوموں کو متاثر ہونا پڑتا ہے۔ یہ اسلام نہیں، بلکہ انسانی تعلقات کی وقتی اور زمانی ضابطہ بندیاں ہیں جو برابر تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ قرآن کے عین زمانۂ نزول میں حالات کی تبدیلی کے سبب سے اس کے بعض احکام تبدیل ہو گئے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی زندگی نے بدلنا اور ترقی کرنا بند کر دیا ہے

اور ان بہت سے قدیم قوانین کو منسوخ کر کے نہیں رکھ دیا ہے جو کبھی انسانی زندگی کی رہنمائی کے لیے نہایت ضروری خیال کیے جاتے تھے۔" (گزٹ آف پاکستان۔ ص۱۲۳۱)

پہلے اس عمیق کلام کا مطلب سمجھ لیجیے اس کے بعد اس سے نکلنے والے حقائق پر غور کیجیے گا۔

ان حضرات کا فرمانا یہ ہے کہ اسلام کے ابدی اصول تو بے شک تبدیل نہیں ہونگے لیکن اسلام نے انسانی زندگی کے مختلف گوشوں میں جو ضابطہ بندیاں کی ہیں وہ تو برابر تبدیل ہوتی رہی ہیں اور زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ برابر تبدیل ہوتی رہیں گی۔ زندگی کے ایک خاص دور میں انسان کے لیے جو لباس تراشا جاتا ہے زندگی کے دوسرے دور میں وہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے دورِ طفولیت میں خاندان کے لیے، سوسائٹی کے لیے، حکومت کے لیے جو ڈھانچے تجویز کیے گئے تھے وہی ڈھانچے ہمیشہ نہیں قائم رکھے جا سکتے۔ اجیر اور مستاجر، زمیندار اور مزارع، محنت اور سرمایہ کے درمیان جو نسبتیں کل تک قائم تھیں اب وہ بدل چکی ہیں اس وجہ سے وہ نظام بھی بدل جانا چاہیے جو پچھلی نسبتوں کو پیشِ نظر رکھ کر بنا تھا۔ ایک خاص طرح کے معاشرتی اور اقتصادی ماحول میں میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات کی جو شکل تجویز ہوئی تھی معاشرتی اور اقتصادی ماحول تبدیل ہو جانے سے لازماً وہ شکل بھی بدل جائے گی۔ اگر کل خاندان کا نظم اس نظریہ پر قائم کیا گیا تھا کہ مرد قوّام ہے تو ضروری نہیں کہ یہی نظریہ آج بھی قائم رہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج یہ نظریہ قائم کر لیا جائے کہ عورت قوّام ہے اور پھر خاندان کا پچھلا سارا ڈھانچہ توڑ پھوڑ کر از سرِ نو بنایا جائے۔ لیکن یہ محض ڈھانچے کی تبدیلی ہوگی اسلام کے "ابدی اصولوں" کی تبدیلی نہیں ہوگی، وہ تو بدستور محفوظ رہیں گے۔ آخر قرآن کے بہت سے احکام حالات کی تبدیلی کے ساتھ عین اس کے زمانۂ نزول میں بدل جاتے رہے ہیں تو اب اس کے احکام کیوں تبدیل نہیں ہو سکتے؟ قرآن نے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ڈھانچہ دیا ہے وہ تو محض ڈھانچہ ہے وہ کوئی اسلام کے ابدی اصول تھوڑے ہی ہیں! وہ اگر روز بدلتے رہیں تو اس سے قرآن اور اسلام کا کیا بگڑتا ہے؟ ابدی اصول تو لوحِ محفوظ میں محفوظ ہی ہیں۔

یہ ہے ان حضرات کے مذکورہ بالا ارشاد کا مطلب، اگر اس کو پُر پیچ الفاظ کے بجائے سادہ

الفاظ میں بیان کیا جائے۔ یہ حضرات بار بار جب اسلام کے "ابدی اصولوں" اور "بنیادی اصولوں" کا ذکر فرماتے ہیں اور یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ ابدی اصول کبھی تبدیل نہیں ہوتے تو آدمی اس خوش گمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کم از کم قرآن تو سراسر ان ابدی اصولوں ہی کا مجموعہ ہے اس وجہ سے اس میں یہ حضرات کسی تبدیلی کی سفارش کی جسارت نہیں فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے سن لیا کہ یہ قرآن بھی ان ابدی اصولوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس نے بھی ہماری انفرادی، ہماری عائلی، ہماری معاشرتی، ہماری معاشی، اور ہماری اجتماعی و سیاسی زندگی کے جو ڈھانچے کھڑے کیے ہیں وہ سب کے سب وقتی اور زمانی ہیں وہ ہمیشہ قائم نہیں رکھے جا سکتے۔ بلکہ یہ تو اتنے بودے اور پھس پھسے ہیں کہ عین زمانہ نزول قرآن میں جب کہ ابھی ان پر چند برساتیں بھی نہیں گزری تھیں حالات کی تبدیلی کے تحت ان میں تبدیلیاں ہوئیں اور اب تو اس کے قائم کیے ہوئے کتنے ڈھانچے ہیں جو بالکل ہی فرسودہ اور بے مقصد ہو کر رہ گئے ہیں اسی طرح آئندہ بھی اگر زندگی کو تغیر و ترقی سے نہیں روکا جا سکتا تو قرآنی احکام کو تغیر و تبدل اور اصلاح و ترمیم کی زد سے بھی نہیں بچایا جا سکتا؛

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر ان عنقا صفت اصولوں کا منبع کہاں ہے جن کو یہ حضرات ازلیت و ابدیت کا مقام بلند عطا فرماتے ہیں؟ وہ سارے کے سارے لوحِ محفوظ ہی میں ہیں یا ان کا کوئی حصہ قرآن میں بھی ہے؟ اگر ان کا کوئی حصہ قرآن میں بھی ہے تو ارکانِ کمیشن سے التجا ہے کہ وہ اس حصہ پر نشان لگا دیں تاکہ مسلمان اطمینان کا سانس لیں کہ کم از کم اتنا حصہ ——— خواہ وہ کتنا ہی قلیل سہی ——— زمانہ کی دستبرد اور ارکان کمیشن کے کلکِ تنسیخ سے محفوظ رہے گا۔ قرآن کا وہ سارا حصہ جو انسانی تعلقات کی ضابطہ بندی کرتا ہے وہ تو ہم نے سمجھ لیا کہ وہ سب کا سب معرض خطر میں ہے عبادات میں سے بھی اکثر کا مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے کیونکہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور قربانی سبھی کسی نہ کسی نوعیت سے وقت کے معاشی، سماجی اور اقتصادی نظریات سے متصادم ہیں۔ اخلاق اور آداب کی بھی خیر نظر نہیں آتی ہے کیونکہ یہ تو ہیں ہی سر تا سر انسانی تعلقات کے تابع۔ بھلا آج عفت، حیا، وفاداری اور صداقت کے وہ معیارات کیا کام دے سکتے ہیں جن کا چلن آج سے سیکڑوں سال

پہلے رہا ہے؟ رہے عقائد تو ان میں سے ممکن ہے کوئی اتنا سخت جان نکلے کہ اس طوفانِ حوادث کا مقابلہ کر سکے لیکن اس کا تعین بھی جب ہی ہو سکتا ہے جب ارکانِ کمیشن اپنے کیمیاوی تجزیہ کے بعد یہ اطمینان دلا دیں کہ فلاں عقیدے کا انسانی زندگی سے دُور قریب کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں تک ہمارے ناقص علم کا تعلق ہے ہم تو یہی جانتے ہیں کہ جتنے بھی عقائد ہیں سب ایک طرف انسان کا تعلق خدا کے ساتھ جوڑتے ہیں دوسری طرف انسان کا تعلق انسان کے ساتھ جوڑتے ہیں اس وجہ سے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی اور انسانی روابط (HUMAN RELATIONS) سے بے تعلق ہو۔ اب تک یہ قائم رہے تو شاید اس وجہ سے قائم رہے کہ اصلی عامل یہ عقائد تھے نہ کہ انسانی تعلقات لیکن اب اگر اصلی عامل کی حیثیت تعلقاتِ انسانی کو حاصل ہو گئی ہے تو لازماً ان کو بھی اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔

بہرحال ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ قرآن کے متعلق اس نظریہ کے بعد اس کی کوئی چیز بھی منسوخ ہونے سے بچ سکے گی۔ لیکن اگر بچ سکے گی تو ارکانِ کمیشن کا اس امت پر بڑا احسان ہو گا اگر تعین کے ساتھ اس کا نام بتا دیں تاکہ ہمیں اطمینان ہو کہ قرآن کے تیس پاروں میں سے کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جو باقی رکھی جائیں گی۔

سنت کے متعلق ارکانِ کمیشن کا نظریہ اس رپورٹ میں سنت کا لفظ اگرچہ بار بار دہرایا گیا ہے لیکن جب ان حضرات کے نزدیک قرآن کی بھی ہر چیز منسوخ ہو سکتی ہے تو پھر غریب حدیث اور سنت کس گنتی میں ہیں؟ اس لفظ کو رپورٹ میں بار بار دہرانے کی مجبوری غالباً یہ پیش آئی ہے کہ ان کی بدقسمتی سے یہ لفظ دستور میں استعمال ہو گیا ہے۔ جب دستور میں استعمال ہو گیا تو مشہور مثل کے مطابق گلے پڑا ہوا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ جن حضرات نے قرآن کو نہیں بخشا ہے وہ سنت کو کب بخشنے والے ہیں۔ چنانچہ ایک بھرپور وار سنت پر بھی اس رپورٹ کے آخر میں کیا گیا ہے۔ اس کے آخر میں ان حضرات نے حکومتِ پاکستان کو یہ نصیحت کی ہے کہ اگر وہ محض قانونِ اسلامی کی پرانی تعبیرات ہی پر قانع ہو کر رہ گئی تو وہ اس ملک میں کوئی بھی موثر اصلاح نہیں کر سکے گی۔ اگر وہ فی الواقع کوئی

اصلاح کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے اس کو انقلابی قدم اٹھانا پڑے گا۔ اس دلپذیر نصیحت کا اختتام علامہ اقبال مرحوم کے ان الفاظ پر ہوتا ہے:

> "مستقبل قریب میں جو سوال تمام مسلم ممالک کے سامنے آنے والا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی قانون، ارتقا کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑی ذہنی کاوش کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کا جواب قطعاً اثبات میں ہو سکتا ہے بشرطیکہ عالمِ اسلامی اس سوال کو اس اسپرٹ کے ساتھ حل کرنے کے لیے آمادہ ہو جو حضرت عمرؓ کے اندر تھی، جو اسلام میں پہلے نقاد اور آزاد خیال فرد ہیں، جنہوں نے پیغمبر صلعم کے آخری وقت میں یہ شاندار الفاظ کہنے کی جرأت دکھائی کہ حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے)"

میں یہاں علامہ اقبال مرحوم کے ان الفاظ پر خود ان کے الفاظ کی حیثیت سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اس وجہ سے یہ معلوم کرنا کہ اس مبہم ارشاد سے ان کا مدعا کیا تھا، ممکن نہیں رہا لیکن پیش کرنے والوں نے اس کو جس سیاق و سباق میں پیش کیا ہے وہ صاف یہی ہے کہ حدیث و سنت کی معروف پابندیوں کے ساتھ اس ملک میں تجدید و اصلاح کا کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اگر کوئی انقلابی قدم اٹھانا ہے تو یہ حسبنا کتاب اللہ کے انقلابی نعرہ ہی کے ساتھ اٹھایا جا سکتا ہے۔

حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ لگانے والے یہ حضرات قرآن کے متعلق جو تصور رکھتے ہیں اس کا بیان تو تفصیل کے ساتھ اوپر ہو چکا ہے۔ اب حدیث اور سنت سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا اندازہ مذکورۂ بالا اقتباس سے کر لیجیے۔ آخر علامہ اقبال کے اس قول کا حوالہ دینے کا منشا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ راشد اور ڈاکٹر اقبال جیسے شاعر اور فلسفی دونوں کو بیک وقت حدیث اور سنت کے خلاف کھڑا کر دیا جائے۔ ایک عام آدمی جب یہ پڑھے گا کہ علامہ اقبال نے یہ بات لکھی ہے تو ان کی شہرت کے پیش نظر اس کے دل میں اس بات پر اعتماد پیدا ہو گا کہ یہ سرسری اور سطحی نہیں ہو سکتی۔ پھر جب وہ یہ پڑھے گا کہ حضرت عمرؓ نے عین رسول اللہ کی وفات کے وقت یہ

بات کہی کہ ہمیں رسول اللہؐ کی کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں، ہمارے لیے تو کتاب اللہ ہی کافی ہے تو وہ ہی اثر اس کے اوپر پڑنے متوقع ہیں۔ اگر وہ خدا ترس اور محتاط آدمی ہوگا تو حیران و سراسیمہ ہو کر رہ جائے گا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ اور اگر بالکل سطحی اور سرسری ذہن کا آدمی ہوگا تو عجب نہیں کہ منکرینِ حدیث کا ہمنوا بن جائے کہ جب اگلوں میں سے حضرت عمرؓ اور پچھلوں میں سے ڈاکٹر اقبال جیسے لوگ قرآن کے ہوتے حدیث اور سنت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو پھر آخر مولوی لوگ اس کو بلاوجہ کیوں اتنی اہمیت دیتے ہیں؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری بیماری میں جس واقعہ کے تعلق سے حضرت عمرؓ کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے وہ ایک اختلافی اور نزاعی واقعہ ہے۔ مولانا شبلی تو سرے سے اس واقعہ ہی کے منکر ہیں۔ اس کے منکر تو بعض اور دوسرے محققین بھی ہیں لیکن میں نے مولانا شبلیؒ کا حوالہ دو وجہوں سے دیا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ حضرت عمرؓ پر جیسی محققانہ کتاب انہوں نے لکھی ہے کسی اور نے نہیں لکھی ہے۔ دوسری یہ کہ ہمارے اس کمیشن نے جن تین چار آدمیوں کو "نقاد" اور "آزاد خیال" مانا ہے ان میں ایک مولانا شبلی بھی ہیں۔ میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس روایت کی بنا پر یہ حضرات، حضرت عمرؓ کو اسلام میں "پہلا نقاد اور آزاد خیال" مانتے ہیں، کمیشن کے ممدوح مولانا شبلی اس روایت کی سرے سے کوئی بنیاد ہی تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن فرض کیجیے کہ حضرت عمرؓ نے یہ بات فرمائی ہے؛ تو یہ ان کے ساتھ کہاں کا انصاف ہے کہ ان کے اس قول کو وہ معنی پہنائے جائیں جو خوارج یا روافض یا منکرینِ حدیث و سنت نے اس کو پہنائے ہیں۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ "حسبنا اللہ" ہمارے لیے اللہ کافی ہے تو اس سے یہ کہاں سے نکل آیا کہ وہ کتاب کی ضرورت کا قائل نہیں ہے یا رسول کی ضرورت تسلیم نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ حسبنا کتاب اللہ تو اس سے حدیث یا دوسرے مآخذِ دین کی نفی کیسے ہو گئی؟ جس طرح لفظ اللہ کے اندر کتاب اور رسول سب شامل ہیں اسی طرح کتاب اللہ کے اندر سنت رسول اللہ شامل ہے۔ حضرت عمرؓ کی پوری زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ انھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کبھی کوئی تفریق نہیں کی۔ سنت تو درحقیقت

کتاب اللہ ہی کی شرح و تفسیر ہے پھر اس کو کتاب اللہ سے الگ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ جس انسان نے بلا اختلاف اس امت کی سب سے زیادہ خدمت کی، جو رسول اللہ کی زندگی میں بھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے ایک ایک نقشِ قدم کا متلاشی رہا، جس نے اپنے شاندار دورِ حکومت میں ان ساری باتوں کا عملاً مظاہرہ کرا دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے، آخر اس کی خدمت میں ان حضرات کی طرف سے یہ کون سا خراجِ تحسین ہے کہ جب رسول اللہ صلعم کی وفات ہونے لگی تو اس نے سنتِ رسول کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا؟ میرے نزدیک تو فاروقِ اعظم کی نسبت اس طرح کی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے دل کے اندر ان کے خلاف نہایت گہرا عناد پوشیدہ ہو۔

ان حضرات نے حضرت عمرؓ کو اسلام میں پہلا نقاد اور آزاد خیال جو قرار دیا ہے اس کی وجہ ہمیں تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کی زندگی کے حالات سے یہ لوگ بالکل ہی بے خبر ہیں۔ ان کے متعلق سنی سنائی کوئی بات کانوں میں اگر پڑی ہوئی ہے تو بس یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کے وصال کے وقت "حسبنا کتاب اللہ" کا انقلابی نعرہ بلند کیا تھا، اس کے سوا اور کسی بات کا ان لوگوں کو پتہ نہیں ہے۔ اگر اور باتوں کا بھی پتہ ہوتا تو یہ لوگ ان کو اسلام میں پہلا نقاد اور پہلا آزاد خیال قرار دینے کے بجائے غالباً ان کو پہلا "رجعت پسند" قرار دیتے، کیونکہ جن باتوں کو ان حضرات نے اس رپورٹ میں اسلام کی آزادانہ روح کے منافی قرار دیا ہے یا جن کو بدعت ٹھہرایا ہے یا جن کو فکری جمود کی نشانی بتایا ہے تقریباً یہ ساری ہی باتیں ایسی ہیں جن کے حضرت عمرؓ قائل اور ان پر عامل رہے ہیں۔ بلکہ بعض تو ان کی اولیات میں شمار ہوتی ہیں اور ایسی تو بلا استثناء سب ہی ہیں جو ان کی وسیع سلطنت میں، جو عرب، عراق، ایران، شام اور مصر سب پر پھیلی ہوئی تھی، برابر ہوتی رہی ہیں لیکن اصلاحات کے انتہائی دلدادہ ہونے کے باوجود اپنے آٹھ نو سال کے دورِ حکومت میں کبھی ان کو ان چیزوں کی اصلاح کا کوئی خیال نہیں آیا۔ ایک ہی وقت میں دی ہوئی تین طلاقوں کو یہ حضرات بدعت قرار دیتے ہیں اور ان کو انہوں نے کالعدم قرار دینے کی سفارش کی ہے لیکن اگر یہ بدعت ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس "بدعت" کے بانی حضرت عمرؓ ہی ہیں۔ سولہ اور اٹھارہ سال سے کم عمر کی شادیاں کمیشن کی رپورٹ میں جرم قرار دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ اگر یہ جرم ہے

تو اپنی زندگی کے آخری دور میں حضرت ام کلثوم کے ساتھ نکاح کر کے اس جرم کا بھی ارتکاب حضرت عمرؓ کر چکے ہیں۔ بلکہ حضرت ام کلثوم کے والد ماجد حضرت علیؓ بھی، جو تمام امت میں سب سے بڑے فقیہ مانے جاتے ہیں، اس جرم میں شریک ہوئے کیونکہ یہ رشتہ انہی کی اجازت سے ہوا۔ پردہ بھی بہرحال ارکان کمیشن کے نزدیک ایک شدید قسم کا جرم ہی ہوگا، اس جرم میں بھی اولیت کا شرف حضرت عمرؓ ہی کو حاصل ہے، روایات میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات جب پردہ نہیں کرتی تھیں تو حضرت عمرؓ اس تمنا کا اظہار بار بار کرتے رہتے تھے کہ کاش یہ پردہ کریں، چنانچہ انہی کی آرزو کے مطابق حجاب کا حکم نازل ہوا۔ طلاقیں بھی انہوں نے دیں اور ان کی مطلقہ بیویوں میں ایک مسلمہ بھی تھیں لیکن ان کو طلاق دینے کا کوئی "معقول سبب" آج تک کسی کو نہیں معلوم ہو سکا۔ عجب نہیں کہ بیک وقت ان کے نکاح میں ایک سے زیادہ بیویاں بھی رہی ہوں اور اگر خود ان کے نکاح میں نہیں رہی ہیں تو ان کی وسیع سلطنت میں تو بہرحال تعدد ازدواج پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔ یہ ساری باتیں اگر جرم ہیں اور محض فقہی تصلب و تشدد کے سبب سے دین میں داخل ہو گئی ہیں تو حضرت عمرؓ اسلام میں پہلے نقاد اور پہلے آزاد خیال کیا ہوئے جبکہ انہوں نے حکومت اور اقتدار رکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی اصلاح نہیں کی بلکہ الٹے اپنے طرز عمل سے ان کو اور زیادہ اجاگر کر دیا؟ کیا محض اس کارنامے پر ان کو آزاد خیال اور نقاد قرار دیا جا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر وقت میں انہوں نے حسبنا کتاب اللہ کا اعلان کرنے کی جرأت کی؟ اگر یہی وجہ ہے تو اول تو جیسا کہ عرض کیا گیا اس بات کی نسبت ہی ان کی طرف صحیح نہیں ہے اور اگر صحیح ہے تو اس کا مدعا وہ ہرگز نہیں ہو سکتا جو یہ حضرات سمجھے ہیں۔ وہ آزاد اور نقاد تو ضرور تھے لیکن اتنے نقاد نہیں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تنقید کریں۔ اور نہ اتنے آزاد خیال تھے کہ آنحضرت صلعم کے آنکھیں بند کرتے ہی ساری حدیث و سنت کی بساط لپیٹ کر رکھ دیں۔

فقہ اسلامی سے متعلق کمیشن کا نظریہ اب آئیے فقہ اسلامی کے متعلق کمیشن کا نظریہ سنیے۔ اسلام کی سادگی اور اس کے ہر قسم کے رسمیات اور ہر قسم کے آصر و اغلال سے پاک و صاف ہونے پر ایک

پر شوکت تمہید کے بعد ارشاد ہوتا ہے :-

"زندگی ایک تخلیقی اور حالات کے ساتھ سازگاری پسند عمل ہے اور یہ بے لچک قوانین کے مقابل میں بصیرت کی زیادہ طالب ہے۔ اسلام کی ابتدائی سادہ اور آزاد روح کی تجدید ہونی چاہیے اور اس کام میں رہنمائی کے لیے ہمیں اسلام کے آغاز کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جب کہ بعد کے اضافوں سے وہ بالکل پاک تھا۔ بعد کے قوانین اور ضوابط کے مجموعوں کا مطالعہ محض تاریخی اہمیت کے واقعات کی حیثیت سے تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کو اسلام کی مجموعیت کے ساتھ ملایا نہیں جا سکتا۔" (گزٹ آف پاکستان ص ۱۲۳۱)

اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ ارکان کمیشن کے نزدیک فقہ اسلامی کی کوئی دینی اور شرعی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی ان کے نزدیک اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ محض تاریخی پہلو سے ہے۔ جس طرح آپ طبری، کامل ابن اثیر اور تاریخ الخلفاء وغیرہ کی مدد سے ایک خاص دور کے حالات و واقعات معلوم کر لیتے ہیں، اسی طرح آپ مبسوط، مدونہ، اور کتاب الام سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی خاص دور میں ہمارے یہاں کیا کیا قانونی رجحانات رہے ہیں۔ اس سے زیادہ ان فقہی ابحاث کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

کمیشن نے ایک مقام پر شریعت اور فقہ کی بحث بھی چھیڑی ہے (ملاحظہ ہو ص ۱۲۰۵) اور وہاں یہ فرمایا ہے کہ ہم شریعت میں کوئی تبدیلی نہیں کر رہے ہیں۔ ہم اگر تبدیلیاں کر رہے ہیں تو فقہ میں تبدیلی کر رہے ہیں جس کی بنیاد تجربات پر ہے۔ جس چیز کی بنیاد تجربات پر ہو وہ صرف علماء ہی کا اجارہ نہیں ہو سکتی، اس میں ہر شخص رائے زنی کر سکتا ہے۔

جہاں تک فقہ اور شریعت کے درمیان فرق کا تعلق ہے اس سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ بات کہ یہ فرق کس قسم کا ہے اور یہ کہ یہ حضرات جو کچھ تصرفات فرما رہے ہیں وہ صرف فقہ ہی تک محدود ہیں، شریعت ان کے حملوں اور ان کی ترکتازیوں سے محفوظ ہے، دونوں قابل بحث ہیں۔

شریعت اور فقہ میں جو فرق ہے، وہ یہ فرق ہرگز نہیں ہے کہ شریعت میں اشخاص کو کوئی مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے اور فقہ کی بنیاد چونکہ تجربات پر ہے اور اس کی جو کچھ اہمیت ہے محض تاریخ کے

پہلو سے ہے۔ اس وجہ سے اس میں ہر شخص اپنا اقول لگا سکتا ہے۔ شریعت اور فقہ میں جو لوگ یہ فرق بیان فرماتے ہیں وہ یا تو شریعت سے بالکل ناواقف ہیں یا فقہ سے۔ یا دونوں ہی سے بالکل بے خبر ہیں۔ شریعت اور فقہ میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ شریعت ماخذ ہے اور فقہ اس ماخذ سے ماخوذ ہے اور ان دونوں میں وہی نسبت ہے جو ماخذ اور ماخوذ میں ہوتی ہے۔ جس حد تک اس کا اخذ صحیح ہے اس حد تک یہ شریعت کا جزو ہے، اس کو شریعت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر اس کے کسی حصہ کے متعلق تنقید سے یہ ثابت ہو جائے کہ اس کے اخذ کرنے میں کوئی غلطی ہے تو بلاشبہ وہ شریعت کا کوئی جزو نہیں ہے۔

اب یہ ایک بالکل قدرتی امر ہے کہ فقہ کے کسی حصہ کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ اس کا اخذ صحیح ہے یا نہیں ہر ایرے غیرے کا کام نہیں ہو سکتا، یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ماخوذ اور اصل ماخذ دونوں پر محققانہ نظر رکھتے ہوں، عام اس سے کہ وہ علماء میں سے ہوں یا غیر علماء میں سے۔ تجربات کو فقہ میں دخل ضرور ہے لیکن وہ دخل اس نوعیت کا نہیں ہے کہ یہ تجربات ہی فقہ اسلامی کی اساس ہوں۔ جن لوگوں نے یہ گمان کیا ہے وہ فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے مواد سے بالکل ہی بے خبر ہیں۔ زندگی کے تجربات فقہ اسلامی کی تعمیر میں صرف اس نوعیت سے شریک ہیں کہ ان کی تحریک نے ماہرین شریعت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا حل شریعت کے اشارات میں تلاش کریں جن کا حل شریعت کے واضح نصوص میں موجود نہیں ہے۔ نہ اس نوعیت سے کہ انہی تجربات کے اینٹ اور روڑے سے فقہ اسلامی کی عمارت کھڑی کر دی گئی ہو۔ ایک مسجد جب تعمیر ہوتی ہے تو اس کی تعمیر میں موسمی تغیرات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ لحاظ اسی حد تک رکھا جاتا ہے جس حد تک یہ مسجد کی مسجدیت پر اثر انداز نہ ہو۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اگر موسمی تجربات مسجد کے قبلہ رُخ بنانے کے خلاف ہیں تو قبلہ ہی بدل دیا جائے اور مسجد کی جگہ کوئی مندر یا کلیسا ہی تعمیر کر لیا جائے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ فقہ کی اصلی اہمیت تو شریعت کے نقطۂ نظر سے ہے لیکن اس کا ایک پہلو تاریخی بھی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کی جو کچھ اہمیت ہے بس تاریخی ہی ہے اور ابن عساکر کی تاریخ بغداد اور سرخسی کی مبسوط میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔ فقہ کا تدریجی ارتقاء ہمیں یہ ضرور بتاتا ہے

کہ کس کس طرح کے محرکات اور عوامل نے ذہنوں کو شریعت پر تدبر کرنے کے لیے اکسایا ہے اور ماہرینِ شریعت نے ہر دور میں اٹھنے والے مسائل کا کس خوبی کے ساتھ حل تلاش کیا ہے۔ یہ بات بالکل مختلف ہے اس بات سے جو ارکانِ کمیشن نے فرمائی ہے کہ فقہی ذخیرہ کی جو کچھ اہمیت ہے بس تاریخ کے نقطۂ نظر سے ہے۔ تاریخ کی کوئی کتاب ہمارے لیے حجت نہیں ہے لیکن فقہ کی ایک کتاب ہر اس شخص کے لیے حجت ہے جو اپنے اجتہاد میں اس کو صحیح سمجھتا ہے اور ایک عامی کے لیے تو دین کے ساتھ وابستہ رہنے کی اس کے سوا کوئی شکل ہی نہیں ہے کہ وہ ان کتابوں پر اعتماد کرے اور زندگی کے مسائل میں ان پر کاربند ہو۔ اگر وہ ان کو محض تاریخ کی حیثیت دے کر اپنے تجربات کی روشنی میں فقہ تیار کرنے کی کوشش کرے گا تو خدا ہی جانے یہ تجربہ اس کو کس کھڈ میں گرائے۔ آج کے تجربات تو یہ ہیں کہ مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اس کے بغیر قوموں کی ترقی ناممکن ہے۔ زنا بالرضا میں کوئی قباحت نہیں ہے، یہ محض ایک معصومانہ تفریح ہے، شراب، جوا، سود، اور سینما سب زندگی کی ناگزیر ضرورتیں ہیں، اب ان چیزوں کو زندگی سے خارج کرنے کی کوشش کرنا سوسائٹی کو رجعت کے غار میں دھکیلنا ہے۔ ان تجربات کے پیچھے پیچھے کون کہہ سکتا ہے کہ کہاں تک جانا پڑے؟

ممکن ہے کسی صاحب کو یہ خوش گمانی ہو کہ یہ سب باتیں تو اس شریعت میں شامل ہیں جس کی نسبت ان حضرات کا یہ اقرار ہے کہ اس میں یہ کوئی تغیر و تبدل نہیں کرنا چاہتے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ کاش ایسا ہی ہوتا اور یہ حضرات متعین طور پر یہ مان لیتے کہ فلاں فلاں چیزیں ان کے نزدیک شریعت ہیں لیکن میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہ اپنی خواہشات کے سوا کسی چیز کو بھی شریعت نہیں مانتے۔ مذہب، قرآن، حدیث اور فقہ کے متعلق ان حضرات کے جو نظریات و تصورات ہیں وہ آپ نے پچھلے صفحات میں معلوم کر لیے ہیں۔ اب ان کے بعد وہ کون سی چیز باقی رہ گئی ہے جس کو یہ شریعت مانیں گے لیکن اگر کسی کو ان کی نسبت اب بھی حسنِ ظن ہے تو آگے کے مباحث یہ اچھی طرح واضح کر دیں گے کہ اپنی خواہشات کے سوا یہ کسی چیز کو بھی شریعت ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ (باقی)